© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

فکر فراہی ۔ مرض اور علاج

اشتیاق احمد ظلی

۱۸۵۷ء کے حادثات ہندوستانی مسلمانوں کے لئے قیامت صغریٰ سے کم نہ تھے۔ سرزمینِ ہند سے انگریز استعمار کو اکھاڑ پھینکنے کی اس آخری اور ناکام کوشش میں مسلمان پیش پیش تھے اس لئے فطری طور پر فاتحین کے غم وغصہ اور ظلم وستم کا سب سے زیادہ نشانہ وہی بنے۔ ایک جوئے خون تھی جوان کے سر سے گذر گئی۔ ان کی عزت ووقار کا پرچم سرنگوں ہوگیا اوران کی جمعیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اب وہ محکوم تھے اور حکومت واقتدار ماضی کی ایک داستان بن کر رہ گئی۔ اس وقت ہندوستان کی ملت اسلامیہ کی حیثیت جسد نیم جان سے زیادہ نہ تھی۔ ہندوستان میں ایسی صورت حال سے ان کو پہلی بار واسطہ پڑا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان حقیقی اسلامی حکومت سے آشنا نہیں ہوا اور یہاں کے باشندے ان برکات سے بہرہ ور نہیں ہوئے جو ایک سچی اسلامی حکومت کا نشان امتیاز ہے۔ یہاں کی مسلم حکومتیں شخصی اور آمرانہ تھیں اور حکمراں کئی مرتبہ ان حدود وقیود کا بھی پاس نہیں کرتے تھے جو شریعت نے متعین کئے ہیں اور امور جہاں داری میں جن کی رعایت ضروری قرار دی ہے۔ اس کے باوجود چونکہ حکمراں مسلمان تھے اس لئے فطری طور پر زندگی کے عام معاملات میں اسلامی تہذیب اور اسلامی روایات کی پاسداری کی جاتی تھی۔ عدالتوں میں قانون شریعت کے مطابق مقدمات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ علم اور علماء کی سرپرستی تھی۔ تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر تھی۔ ملازمتیں دستیاب تھیں۔ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ حاکم قوم ہونے کا احساس۔ یہ سب دفعتاً ختم ہوگیا۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہوگئے۔ سرکاری معافیوں، عطیات اور اوقاف پر حکومت نے قبضہ کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیشمار پرانے خاندان تباہ اور برباد ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار سرکاری معافیوں اور عطیات پر تھا یکسر تہ و بالا ہو گیا۔ علماء، امراء اور صف اول سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد فاتح قوم کی بے رحمانہ انتقامی کاروائی کا نشانہ بن گئی۔ چنانچہ اس وقت ملت کے حساس اور باشعور افراد کے سامنے ایک بڑا سوال یہ تھا کہ زخموں سے چور اور احساس جراحت سے نڈھال قوم کے تشخص کو کس طرح باقی رکھا جائے اور اس کے اندر کس طرح زندگی کا حوصلہ پیدا کیا جائے۔ یہ ایک بڑا چیلنج بھی تھا اور ایک لمحہ فکر یہ بھی۔ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کا بقا اور اس کے مستقبل کے امکانات براہِ راست اس سوال سے جڑے ہوئے تھے۔ صورتِ حال کی نزاکت اس بات کی متقاضی تھی کہ اس سے عہدہ براہونے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں۔ دردمندان ملت حالات کی سنگینی اور فوری اقدام کی ضرورت سے واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرف سے ردّعمل میں تاخیر نہیں ہوئی۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ امت کا باشعور طبقہ حالات کا معروضی تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند تھا اور یہ صلاحیت بھی رکھتا تھا کہ اس نہایت پیچیدہ صورت حال سے عہدہ براہونے کے لئے مناسب اقدامات اور تجاویز پر غور کر سکے اور انہیں عملی جامہ پہنا سکے۔ یہ انہیں بروقت اقدامات کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کا شیرازہ یکسر بکھرنے سے محفوظ رہ گیا اور اس کے وقار کی دوبارہ بحالی اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گذارنے کے اسباب و حالات پیدا ہوئے۔

ان حالات سے عہدہ براہونے کے لئے مسلمانان ہند کی طرف سے جو اقدامات کئے گئے ان کے نتیجہ میں دو تحریکیں ابھر کر سامنے آئیں؛ علی گڑھ تحریک اور دیوبند۔ دونوں نے ایک دوسرے سے یکسر مختلف حکمت عملی اختیار کی۔ دونوں نے اپنے اپنے دائرہ کار میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں اور ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ دونوں تحریکوں نے اصلاح احوال کے لئے تعلیم کو وسیلہ اور ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ ان کے زیر اثر ہندوستان کے طول وعرض میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے شمار درس گاہیں قائم ہوئیں جہاں انہیں نمونہ اور ماڈل کے طور پر اختیار کیا گیا۔

۱۸۵۷ء کے جلو میں انگریزوں کے ہاتھوں اس ملک میں ہونے والی ہمہ گیر تباہی اور بربادی کے دردناک مناظر کا سرسید نے بچشم خود مشاہدہ کیا تھا اور اس کی تپش کو خود بھی محسوس کیا تھا۔ اس حادثہ نے ان کو ہلا کر رکھ دیا اور ان کے دل و دماغ پر اس کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوئے۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب اس تکلیف دہ صورت حال سے بچنے کے لئے انھوں نے کسی اور ملک کی طرف ہجرت کر جانے کے بارے میں بھی غور کیا۔ لیکن ان کی شرافت نفس نے یہ گوارا نہ کیا کہ قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر خود اپنی جان بچا کر چلے جائیں۔ بالآخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ قوم کی اصلاح اور اس کو اس صورت حال سے نکالنے میں اپنی زندگی صرف کردیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کی طویل اور صبر آزما جدوجہد دراصل اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ فاتح قوم کے منتقمانہ غم و غصہ کا زیادہ تر نشانہ مسلمان بنے تھے۔ حکومت کی بلندی سے محکومیت کی پستی کا سفر یوں بھی بڑا حوصلہ شکن اور اذیت ناک ہوتا ہے۔ پھر مسلمانوں کو جانی، مالی اور نفسیاتی سطح پر سخت ہزیمت اور پسپائی اٹھانی پڑی تھی اور شدید نقصان سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ انہیں اس پیچیدہ صورت حال سے نکالنا اور ان کے اندر عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گذارنے کا حوصلہ پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا اور نہ ہی اس کے حصول کا کوئی سریع الاثر نسخہ تھا۔ پوری صورت حال پر لمبے غور و فکر کے بعد سرسید اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس مرض کا صرف ایک ہی تریاق تھا اور وہ تھا جدید تعلیم کا حصول۔ اس کے بغیر اس سلسلہ میں کی جانی والی کسی کوشش کی کامیابی کے امکانات بہت کم تھے۔ اگرچہ اس کام کی منصوبہ بندی میں مزید اور کچھ وقت لگا لیکن انہوں نے اس سمت میں سفر کا آغاز فوراً ہی کردیا تھا جیسا کہ ۱۸۵۹ء میں یعنی ناکام جنگ آزادی کے دو سال کے اندر ہی مرادآباد میں مدرسہ کی تاسیس سے واضح ہے۔

اس سلسلہ میں ۱۸۶۹ء ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال انہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اپنے دونوں بیٹوں سید حامد اور سید محمود کے ساتھ انگلینڈ کا سفر کیا اور وہاں تقریباً سترہ مہینہ قیام کیا۔ وہاں قیام کے دوران انہوں نے انگلینڈ کی لائبریریوں میں بیٹھ کر ولیم میور کی بدنام زمانہ کتاب Life of Mahomet کی تردید کے لئے ضروری مواد فراہم کیا اور اس کا ایک نہایت مدلل اور مسکت جواب لکھا۔ معلوم ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے حضور رسالتمآب ﷺ کی ذات گرامی پر نہایت رکیک اور ناروا حملے کئے تھے۔ خطبات احمدیہ نہ صرف یہ کہ سیرت پاک پر اردو میں پہلی باضابطہ کتاب ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مواد اندازِ بیان اور طرز استدلال کے نقطہ نظر سے ایک نہایت قیمتی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ وہاں قیام کے دوران انہوں نے وہاں کی تہذیب وتمدن اور تعلیمی اداروں اور ان میں رائج نظام تعلیم وتربیت کا بغور مطالعہ کیا۔ انہوں نے وہاں کے مشہور تعلیمی اداروں ہیرو اور ایٹن اور شہرہ آفاق جامعات آکسفورڈ اور کیمبرج کو بہت غور سے دیکھا اور وہاں کی تعلیمی اور غیر تعلیمی مصروفیات کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ ان سب کے نتیجہ میں ان کی سوچی سمجھی یہ رائے بنی کہ یورپ کی غیر معمولی ترقیوں کے پیچھے دراصل تعلیم کے اثرات کارفرما ہیں۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کے دل ودماغ میں انگریزوں سے بیزاری اور نفرت کے باعث مغربی تعلیم کے سلسلہ میں ان کے درمیان پائے جانے والے یکسر منفی رویہ کو دور کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ وہ اب بھی بڑی حد تک عہد وسطیٰ سے چلی آرہی روایات اور نظریات کے اسیر تھے۔ مسلم معاشرہ کو نئے رجحانات نیز جدید تعلیم اور تہذیبی اقدار سے روشناس کرانے کے لئے ان تعصّبات اور تحفظات کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنا ضروری تھا جو اس صورت حال کے لئے ذمہ دار تھے۔ اس کے بغیر اس تعلیمی مشن کی کامیابی کے امکانات اگر یکسر معدوم نہیں تو محدود ضرور تھے۔ سرسید نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس دور کے مسلم سماج میں بہت سی ایسی روایات اور رسوم مقبول اور رائج تھے جن کا اسلام کی بنیادی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہیں تھا بلکہ وہ ماحول اور وقت کی دین تھے اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کے ملی تشخص کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حصہ بن گئے تھے۔ ان کی اصلاح بھی وقت کی ایک بڑی ضرورت تھی۔ ان گونا گوں مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے ایک رسالہ کے اجراء کا فیصلہ کیا جس کے ذریعہ عام مسلمانوں تک اس تعلیمی اور اصلاحی پروگرام کا پیغام پہونچایا جاسکے اور ان کے اندر اصلاح احوال کی ضرورت اور اہمیت کا احساس بیدار کیا جاسکے۔ یہ خیال بھی در اصل انگلینڈ کے حالات سے واقفیت کی دین تھا۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ بعض رسائل انگریز معاشرہ کے خیالات اور رجحانات کی تشکیل میں غیر معمولی کردار ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے انگلینڈ میں قیام کے دوران ہی نہ صرف یہ کہ یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ہندوستان واپسی کے بعد ان کو اس مقصد سے ایک رسالہ شائع کرنا ہے بلکہ اس کی تفصیلات، لائحہ عمل اور نام بھی طے کرلیا تھا۔ چنانچہ جب وہ ہندوستان واپس آئے تو ان کے ساتھ تہذیب الاخلاق کا پورا خاکہ موجود تھا۔ ۲۴/ دسمبر ۱۸۷۰ء کو تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ علی گڑھ تحریک کے پیغام کو عام کرنے اور اس کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں 'تہذیب الاخلاق' نے جو غیر معمولی کردار ادا کیا ہے وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔

مختلف مراحل سے گذرنے کے بعد ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم مسلمانان کا سنگ بنیاد رکھا گیا جس نے بعد میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قالب اختیار کیا۔ اس ادارہ نے بہت جلد مسلمانان ہند کے لئے ایک تعلیمی اور تہذیبی مرکز کی حیثیت اختیار کرلی۔ جیسا کہ معلوم ہے اس ادارہ کی تاسیس کے پیچھے بنیادی مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم سے بہرہ ور کرنا تھا تاکہ وہ انحطاط و زوال کی تاریکی سے نکل کر ترقی کی روشنی کی طرف پھر اپنا سفر شروع کرسکیں اور قوموں کے درمیان اپنا کھویا ہوا عزت و وقار کا مقام حاصل کرسکیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ سرسید کو اسلامی تشخص کا تحفظ اور بقا بھی بہت عزیز تھا۔ ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ یہاں سے طلبہ ایک طرف تو جدید تعلیم سے آراستہ ہوں اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور ساتھ ہی بحیثیت مسلمان بھی اپنی شناخت باقی رکھیں۔ جو ترقی اس شناخت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قربان کر کے حاصل ہو وہ انہیں منظور نہیں تھی۔

علی گڑھ تحریک کے علاوہ مسلمانوں کو درپیش صورتِ حال کے سلسلہ میں ایک اور تحریک بھی اس سے پہلے سے سرگرم عمل تھی جس کا مرکز دیوبند تھا۔ یہ تحریک بھی تعلیم ہی کو اصلاح احوال کے لئے ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ اس تحریک کے قائدین نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں فعّال کردار ادا کیا تھا لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ بدلے ہوئے حالات میں بزورِ قوت کوئی تبدیلی بروئے کار لانے کے امکانات اب یکسر ختم ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ہتھیار کے بجائے زبان وقلم کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ سیاسی اقتدار اور معاشی استحکام سے محرومی کے بعد مسلمانوں کا تعلیمی نظام شدید بحران کا شکار تھا۔ اس بحران سے نمٹنے کے لئے نئی سوچ، نئے عزم اور اقدامیت کی ضرورت تھی۔ جہاں جدید تعلیم کے میدان میں اس نئی سوچ اور اقدامیت نے علی گڑھ تحریک کا قالب اختیار کیا وہیں دینی تعلیم کے میدان میں نئی سوچ، نئے عزم اور نئے امکانات کا مظہر دیوبند تھا۔ یوں تو دینی تعلیم کے باب میں دیوبند کی خدمات غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں لیکن حکومتی سرپرستی سے محرومی کے بعد عوامی تعاون کے ذریعہ دینی تعلیم کا بندوبست بلاشبہ ایک انقلابی قدم تھا۔ اس باب میں دیوبند نے جو راستہ ۱۸۶۷ء میں دکھایا تھا دینی مدارس آج بھی اسی راستے پر گامزن ہیں اور یہ ہندوستان میں دینی تعلیم کے نظام کے بقا کی ضمانت ہے۔

اس طرح دونوں تحریکوں میں اس حد تک مماثلت اور یکسانیت ضرور تھی کہ دونوں ہی مسلم معاشرہ کے مسائل کا حل ان کے درمیان تعلیم کے فروغ اور توسیع کو سمجھتے تھے۔ اس کے آگے دونوں کے راستے جدا ہو جاتے تھے۔ علی گڑھ تحریک یہ یقین رکھتی تھی کہ جدید تعلیم کے حصول کے بغیر مسلمان ترقی نہیں کر سکتے اور ان کو قوموں کی برادری میں عزت و آبرو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے فطری طور پر ان کی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کے دل و دماغ سے مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے خلاف پائے جانے والے جذبات کو نرم کیا جائے اور انہیں جدید تعلیم کی طرف مائل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا جائے۔ دارالعلوم دیوبند کے موسسین اس نتیجہ تک پہونچے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی تشخص کو باقی رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے اندر دین کا صحیح فہم پیدا کیا جائے اور مسلم معاشرہ کو غلط روایات و رسوم سے پاک کیا جائے جو دین کی روح کے منافی تھے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ایسے باعمل علماء تیار کئے جائیں جن کو علوم دینیہ میں رسوخ حاصل ہوتا کہ وہ ملت کی صحیح دینی قیادت کا فریضہ انجام دے سکیں۔ ان کے ذریعہ دین کا صحیح فکر عام ہوگا اور وہ معاشرہ کے اسلامی تشخص کے بقا کا بہترین ذریعہ ثابت ہوں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ دونوں تحریکوں کے اس باب میں احساسات ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے کہ اس وقت مسلمانوں کا اصل مسئلہ کیا تھا اور اسی لحاظ سے ان کا طرز عمل اور حکمت عملی بھی ایک دوسرے سے بالکل الگ تھی۔

ہندوستان میں رائج نصاب تعلیم میں بالخصوص سولہویں صدی سے اکبری دربار کے ایک ایرانی امیر اور دانش ور فتح اللہ شیرازی کے زیر اثر معقولات کا تناسب غیر معمولی حد تک بڑھ گیا۔ بعد میں جب ملا نظام الدین سہالوی (۱۶۷۸۔۱۷۴۸ء) نے درس نظامی کو ترتیب دیا تو وہ بھی معقولات سے اس حد تک گرانبار تھا کہ بقول مفتی محمد رضا فرنگی محلی مصنف "بانی درس نظامی استاد الہند ملا نظام الدین محمد فرنگی محلی" "درس نظامی کی ایک خصوصیت یہ ہے اور اس بنا پر اس پر اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں معقولات کی تدریس پر ہی سارا زور صرف کر دیا گیا ہے اور علوم شرعیہ قریب قریب نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔" شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳۔۱۷۶۲) نے جو ملا نظام الدین کے ہم عصر بھی تھے اس صورت حال کے تدارک کی کوشش کی۔ یوں تو ان کے علمی اور اصلاحی کارناموں کی متعدد جہات ہیں اور ان کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن یہاں ان میں سے بعض کا ذکر مناسب حال ہوگا۔ اس سلسلہ میں ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ رجوع الی القرآن ہی میں ان کے جملہ مسائل کا حل ہے۔ وہ اس نتیجہ تک پہونچے کہ مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب اسلام کی تعلیمات سے ناواقفیت اور مسلکی گروہ بندی تھی جس کے باعث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ قرآن مجید کو سارے ہی مسلمان اسلام کا بنیادی ماخذ تسلیم کرتے ہیں چنانچہ اگر ان کے اندر قرآن کا صحیح فہم پیدا کیا جا سکے تو بہت سے اختلافات اور باہمی منازعت کے اسباب خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے انہوں نے قرآن مجید کا آسان فارسی زبان میں ترجمہ کیا جسے عام مسلمان بہ آسانی سمجھ سکیں۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اس سے پہلے فارسی زبان میں جو ترجمے اور تفسیریں دستیاب تھیں وہ عام فہم نہیں تھیں۔ ساتھ ہی انہوں نے علم حدیث کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔ شاہ صاحب نے مختلف مسالک کے درمیان اختلاف اور کشیدگی کو کم کرنے اور فقہی اختلافات کے سلسلہ میں راہ اعتدال تلاش کرنے کی کوشش کی اور اس باب میں ان کی مساعی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

دار العلوم دیوبند تحریک ولی اللہی کے زیر اثر قائم کیا گیا۔ اس کی تاسیس جن بزرگوں کے ہاتھوں انجام پائی وہ اسی مکتب فکر کے تربیت یافتہ تھے اور ان کا فکری نسب نامہ براہ راست شاہ صاحب سے ملتا ہے۔ اس لئے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ دار العلوم کے نصاب تعلیم اور اس کی دوسری علمی سرگرمیوں میں ولی اللہی مکتب فکر کے نمایاں پہلوؤں کا بھرپور انعکاس پایا جائے گا۔ لیکن شاید ان مخصوص اور غیر معمولی حالات کے باعث جن میں دار العلوم کی بنیاد رکھی گئی یہ ممکن نہ ہو سکا اور دار العلوم نے اپنے نصاب تعلیم کے لئے مجموعی طور پر درس نظامی کو اختیار کیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں کے نصاب تعلیم میں قرآن مجید کو اولیت حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ حدیث اور فقہ میں دار العلوم نے درس نظامی سے ہٹ کر اپنی راہ خود بنائی۔ درس نظامی میں حدیث کی صرف ایک کتاب 'مشکوۃ المصابیح' پڑھائی جاتی تھی۔ دار العلوم نے صحاح ستہ کے دورے کا اہتمام کیا۔ حدیث پر خصوصی توجہ وہاں کا نشان امتیاز قرار پائی چنانچہ وہاں کے اساتذہ میں سب سے زیادہ اہمیت شیخ الحدیث کو حاصل رہی ہے۔ فقہ بھی دار العلوم کی دلچسپی کا خاص موضوع قرار پایا۔ لیکن اس میدان میں بھی دار العلوم نے اپنا لائحہ علم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ولی اللہی مسلک سے ہٹ کر طے کیا۔ شاہ صاحب نے فقہی اختلافات میں راہ اعتدال تلاش کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ مسلکی تحزب اور تعصب جس نے مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف آمادہ پیکار کر رکھا تھا، اس کے تدارک کی سبیل کی جا سکے۔ دیوبند نے پوری شدت اور صلابت سے فقہ حنفی پر عمل کیا اور حدیث اور فقہ کی تدریس میں بھی یہی نقطۂ نظر پوری قوت سے حاوی رہا۔ چنانچہ دارالعلوم کی عظیم الشان خدمات اور دینی علوم کی توسیع و ترویج میں اس کے غیر معمولی اکتسابات کے باوجود یہ ایک امر واقعہ ہے کہ دیوبند کے نصاب میں توازن کی کمی تھی ورنہ اس کی خدمات کا دائرہ کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے کہیں زیادہ ہوتا۔ لیکن یہ بات فراموش نہیں کی جانی چاہئے کہ دارالعلوم نے بڑے پرآشوب دور میں مسلمانوں کی مذہبی قیادت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ اس کا کسی قدر اندازہ دارالافتاء کی کارکردگی کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ ملک کے مختلف گوشوں اور خطوں سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگ مذہبی امور میں رہنمائی کے لئے اس کی طرف دیکھتے رہے ہیں۔

مولانا فراہی نے جب مسلمانوں کے ہمہ گیر زوال وانحطاط کے اسباب وعلل اور ان کو نکبت وادبار کے اس گرداب سے نکالنے کے بارے میں غور وفکر شروع کیا ہوگا تو تعلیم کے میدان میں سرگرم عمل یہ دونوں تحریکیں ان کے سامنے تھیں۔ یہ دونوں تحریکیں اپنے اپنے دائرہ کار میں نہایت مفید، وقیع اور قابل قدر کام انجام دے رہی تھیں۔ مولانا علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ وہاں سے انہوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ جدید نظریات اور فلسفہ سے واقفیت ہی حاصل نہیں کی بلکہ ان کا گہرا مطالعہ کیا اور علمی اور ذہنی سطح پر اپنے آپ کو اس کام کے لئے تیار کیا جو ان کے پیش نظر تھا۔ وہاں کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے وہ وہاں کے مضبوط اور کمزور پہلوؤں سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کے حل کے لئے انہوں نے اس ماڈل کا انتخاب نہیں کیا جس کی نمائندگی علی گڑھ کرتا تھا۔ البتہ جدید تعلیم سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

براہ راست واقفیت کی وجہ سے وہ اندازنو سے ڈرنے اور طرز کہن پر اڑنے والے نہیں تھے چنانچہ جہاں کہیں ضرورت ہوئی اور حالات کا تقاضا ہوا وہاں انہوں نے جدید نافع کو اختیار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی۔ اسی طرح انہوں نے قدیم علماء کے سامنے زانوے تلمذ بھی تہ کیا اور اس حد تک ان سے انہیں اتفاق بھی تھا کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل بنیادی طور پر دین سے ان کی وابستگی میں مضمر ہے اس لئے اصولی طور پر یہ حل دینی تعلیم ہی کے ذریعہ مہیا کیا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ دارالعلوم کے فراہم کردہ ماڈل سے بھی متفق نہیں ہو سکے۔ چنانچہ ان کو اپنی راہ خود نکالنی پڑی۔

گہرے غور و فکر اور تاریخ اسلام کے مختلف ادوار کا نہایت باریک بینی سے تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ تک پہونچے کہ مسلمانوں کا عروج و زوال دراصل کتاب اللہ سے ان کے تعلق کی نوعیت سے وابستہ ہے۔ جب وہ قرآن کو اپنی زندگی میں وہ مقام دیں گے جو اللہ کی کتاب اور خالق کائنات کی طرف سے انسانیت کے لئے آخری صحیفہ ہدایت کی حیثیت سے اس کا حق ہے وہ ناقابل تسخیر اور دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے بہرہ ور اور سرفراز رہیں گے۔ اور جب ان کی زندگی میں اس کا وہ مقام باقی نہیں رہے گا تو ان کے زوال انحطاط اور زبوں حالی کی بھی کوئی حد نہیں ہوگی اس لئے کہ ''لن یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح بها اولها '' اور کون نہیں جانتا کہ اولین مسلمانوں کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا راز کتاب اللہ سے مکمل وابستگی اور اس کی ہدایت اور تعلیمات کی غیر مشروط اطاعت اور اتباع میں مضمر تھا۔ اس امت کے عروج و زوال کا اصول یہ ہے'' إنّ الله يرفع بهذا القرآن اقواماً ويضع به آخرين '' چنانچہ مسلمانوں کے جسد ملی کو دراصل جو مرض لاحق تھا اور جس کے علاج کے بغیر اصلاح احوال کی کسی بھی کوشش کی کامیابی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی وہ یہی تھا اور کتاب اللہ کی طرف رجوع ہی اس کا حقیقی اور مستقل علاج تھا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کتاب اللہ کے حقیقی کردار کو بحال کیا جائے اور اسے حاکمیت کے منصب پر فائز کیا جائے جو اس کا اصل مقام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کی صورت کیا ہو بالخصوص جب کہ امت کے درمیان قرآنی آیات کے معانی و مفاہیم کی تفسیر و تشریح کے سلسلہ میں غیر معمولی اختلاف رای پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے درمیان ابھرنے والے بے شمار فرقے اپنے مزعومات اور باطل عقائد تک کے اثبات کے لئے قرآن سے استشہاد کرتے ہیں اور اس مقصد کے لئے قرآنی آیات کی من مانی تاویل کرکے اور ان کے مفہوم و مدلول کو توڑ مروڑ کر اپنے نقطہ ہائے نظر کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کی صورت حال سے بچنے کے لئے قرآن مجید پر تدبر و تفکر کے لئے ایک ایسے منہاج اور میتھاڈالوجی کی ضرورت تھی جس کے ذریعہ قرآنی آیات کی تفسیر و تاویل میں اختلاف کی راہ مسدود ہو سکے۔ اس کے بغیر امت کا کسی ایک موقف پر جمع ہونا سخت مشکل تھا۔ لیکن عملاً صورت حال یہ تھی کہ قرآن مجید کی تفسیر و تاویل کے جو طریقے عام طور سے رائج اور معروف تھے وہ اس صورت حال سے عہدہ برا ہونے کے لئے کافی نہیں تھے۔ چنانچہ اس کے لئے ایک انقلابی فکر اور قرآن پر تدبر و تفکر اور قرآنی آیات کی تفسیر و تاویل کے لئے ایک نئے منہاج کی ضرورت تھی۔

طویل غور و فکر اور اس سے زیادہ فضل ربانی کی دستگیری سے انہوں نے قرآن پر تدبر کی شاہ کلید کو پالیا اور ایک ایسے منہاج کی ترتیب و تنقیح میں کامیاب ہو گئے جس سے یہ مقاصد بخوبی حاصل ہو سکتے تھے۔ تصور نظم قرآن قرآن فہمی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ یہ ایک انقلاب آفریں تصور ہے جس سے کتاب اللہ کے معارف و حکم تک رسائی کی راہ باز ہوتی ہے۔ یہ قرآن مجید پر تدبر و تفکر کا ایک ایسا منہاج اور میتھاڈالوجی فراہم کرتا ہے جو مضبوط علمی اور عقلی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس منہاج سے قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو تفسیر و تاویل میں پائے جانے والے بے شمار اختلافات ختم ہو جائیں اس لئے کہ ”تاویل کا بیشتر اختلاف نتیجہ ہے اس بات کا کہ لوگوں نے آیات کے اندر نظم کا لحاظ نہیں رکھا۔ اگر نظم کلام ظاہر ہوتا اور سورہ کا عمود یعنی مرکزی مضمون واضح طور پر سب کے سامنے ہوتا تو تاویل میں کسی طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا اختلاف نہ ہوتا اور سب ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے اور سب کے منھ سے ایک ہی صدا بلند ہوتی۔" اور اس طرح باہمی اختلاف وافتراق کے اسباب ختم ہوجاتے جس نے امت کے مختلف گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار کررکھا ہے۔ قرآن مجید پر مستشرقین کا ایک بڑا الزام یہ رہا ہے کہ یہ ایک غیر مربوط کتاب ہے۔ تصور نظم قرآن اس الزام کا مدلل اور شافی جواب فراہم کرتا ہے۔ اس کے امکانات اور مضمرات انشاء اللہ وقت کے ساتھ ساتھ واضح ہوتے جائیں گے اس لئے کہ مستقبل کا قرآن فہمی کا منہاج یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کی صداء بازگشت دنیا کے مختلف علاقوں اور گوشوں سے سنائی دے رہی ہے اور اس کی ضرورت اور اہمیت کا احساس اہل علم کے درمیان روز افزوں ہے۔

تصور نظم قرآن فکر فراہی کا سب سے نمایاں عنصر ہے لیکن یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ یہ فکر نظم قرآن تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہ دراصل ایک پورے فکری نظام اور ایک فلسفہ کا نام ہے۔ اس کی اساس مکمل اور غیر مشروط طور پر کتاب اللہ کی طرف واپسی ہے۔ فکر فراہی کا نصب العین یہ ہے کہ فکر ونظر اور علم ودانش کے تمام پیمانوں کو قرآن کے تابع بنادیا جائے، جملہ علوم وفنون کی تطہیر اور تشکیل جدید قرآن کی ہدایات اور تعلیمات کی روشنی میں کی جائے اور زندگی کا ہر گوشہ اور ہر شعبہ اسی کی تعلیمات کا تابع ہو۔

(انشاء اللہ اس فکر کے اہم پہلوؤں کا آئندہ ان صفحات میں مطالعہ کیا جائے گا۔)

۱۳/اپریل ۲۰۰۵ء

© rasailojaraid.com